حکم و عبر

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

تزکیہ

۹ جنوری ۱۹۸۶ء کو بعد نماز مغرب جامع القرآن، قرآن اکادمی ماڈل ٹاؤن لاہور میں "تنظیم اسلامی لاہور" کے ماہانہ اجتماع میں امیر تنظیم محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی زیر صدارت جناب ڈاکٹر ابصار احمد صاحب، حافظ عاکف سعید صاحب اور مولانا سعید الرحمٰن علوی صاحب نے تربیتی نقطۂ نظر سے تقریریں کیں، جو بے حد پسند کی گئیں۔ مولانا علوی صاحب کا زیادہ حصّہ تحریر کی شکل میں تھا جس میں بعض اضافے انہوں نے بعد میں کئے۔ اور اس پر نظرِ ثانی بھی کی۔ یہ تحریر بصد مسرّت شاملِ اشاعت کی جا رہی ہے۔

(ادارہ)

أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـــ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

یہ آیت کریمہ سورۂ بقرہ کی ہے۔ اس کا نمبر ۱۲۹ ہے۔ جناب خلیل اللہ علیہ السلام نے جب اپنے فرزند ذبیح اللہ علیہ السلام کی معیت و رفاقت میں کعبۃ اللہ کی تعمیر کی تو اس وقت اپنے رب کے حضور کچھ دعائیں کیں، جن میں سے ایک دعا کا ذکر اس آیت میں ہے۔ جس کا ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیا کہ ـــــ

"اور خدایا (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول پیدا ہو، وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے، کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور (اپنی پیغمبرانہ تربیت سے) ان کے دلوں کو مانجھ دے، اے پروردگار بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو حکمت والی اور سب پر غالب ہے!"

اللہ تعالیٰ نے ان کی سبھی دعاؤں کو قبول کیا اور یہ دعا جس میں ایک عظیم المرتبت رسول کی بعثت کی درخواست تھی اسے محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلّم کی بعثت کی شکل میں قبول

© rasailojaraid.c

فرمایا: خالد بن معدان رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت ہے:

ان نفرًا مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلّم قَالُوا لَہٗ یا رَسُوْلَ اللّٰہ اَخْبِرْنَا عَنْ نَفْسِکَ؟ قَالُوْا نعم! اَنَا دَعْوَۃُ اَبِیْ اِبْرَاھِیْمَ وَ بُشْرٰی عِیْسٰی (القرطبی ص۱۳۱ - ج ۲)

(ترجمہ) "صحابہ کرام میں سے کچھ حضرات نے درخواست کی کہ ہمیں اپنے متعلق کچھ بتلائیے، تو آپ نے فرمایا: ہاں! میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور اپنے بھائی عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔"

ایک روایت میں اس کے بعد ایک لفظ اور بھی ہے کہ "درؤیا امی" (اور میں اپنی والدہ محترمہ کا خواب ہوں۔

اور خود قرآن عزیز نے تین مقامات پر حضور اقدس علیہ السلام کی بعثت کا ذکر کیا تو ٹھیک ٹھیک اسی انداز سے اور جن خصائل کے مالک نبی کی درخواست سیدنا خلیل اللہ نے کی تھی، انہی کا ذکر کرکے بعثت رسول سے خلق خدا کو آگاہ کیا۔ ایک آیت سورۂ بقرہ ہی میں ہے۔ جس کا نمبر ۱۵۱ ہے دوسری آل عمران میں ہے جس کا نمبر ۱۶۴ ہے اور تیسری الجمعہ میں ہے۔ جس کا نمبر ۲ ہے۔ اس کے الفاظ ہیں۔

ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیَاتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ (الآیہ)

کہ وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرمایا، جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ (ترجمہ مولانا احمد علی لاہوری)

اس میں ایک لفظ "یُزَکِّیْھِمْ" آیا ہے، ہماری گفتگو اس وقت اسی کے حوالہ سے ہوگی۔

لیکن اس سے قبل "القرطبی" نے ان چار چیزوں سے متعلق جو لکھا ہے ملاحظہ فرمالیں:

ان الآیات تلاوۃ ظاہر الالفاظ، والکتاب معانی الالفاظ والحکمۃ الحکم وھو مراد اللّٰہ بالخطاب من مطلق ومقید ومفسر ومجمل وعموم وخصوص...... الخ (ص۱۳۱، ج ۲)

(ترجمہ) آیات کی تلاوت سے مراد قرآن عزیز کے ظاہری الفاظ کی تلاوت ہے، تعلیم کتاب کا مقصد الفاظ کے معانی کو سکھلانا ہے اور "الحکمۃ" سے مراد "الحکم" ہے

.com

یعنی خطاب میں اللہ تعالیٰ کی مراد کو اس طرح ظاہر کرنا کہ معلوم ہو جائے کہ وہ مطلق ہے یا مقید، مفسّر ہے یا مجمل، عام ہے یا خاص۔۔۔۔ الخ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ " الحکمۃ " سے متعلق یہاں " مبادیٔ تدبر قرآن " کے حوالہ سے کچھ گذارشات پیش کر دی جائیں۔

"حکمت کوئی خارجی چیز نہیں بلکہ خود قرآن کا حصّہ ہے، اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ حکمت" کے لئے بھی قرآن میں " یُتلیٰ " " انزل " اور " اُوحِیَ " جیسے الفاظ آئے ہیں دوسری دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید کے دلائل و براہین کو " حکمت بالغہ " کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور خود قرآن کو " قرآن حکیم " کہا گیا (القمر: ۵ و یٰسٓ: ۲) وغیرھا من الدلائل ـــ لغت میں " حکمت " سے مراد وہ قوت ہوتی ہے جو صحیح فیصلہ کا سرچشمہ ہو۔ جیسے قرآن میں حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے ہے۔ " اٰتَیْنٰہُ الْحِکْمَۃَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ " (ص، ۲۰) یعنی ہم نے اسے حکمت دی اور فیصلہ کن بات کرنے کی لیاقت " ـــ اہل عرب اس لفظ کو اس قوت کے لئے استعمال کرتے تھے جو عقل و رائے کی پختگی اور شرافت اخلاق دونوں کی جامع ہو اور عاقل و مہذب آدمی کو حکیم کہتے ہیں۔ نیز حکمت سے مراد " فصل خطاب " بھی ہے۔ جس سے مقصود ایسی تلی بات ہے جو عقل اور دل دونوں کے نزدیک واضح ہو۔۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے اس لفظ کو اس کے اعلیٰ ترین مفہوم کے لئے استعمال کیا یعنی وحی کے لئے، وحی کو جس طرح نور، برہان، ذکر، رحمت وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا اسی طرح لفظ " حکمت " سے بھی تعبیر کیا اور اسی پہلو سے قرآن مجید کا نام " **حکیم** " رکھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمت، کلام اور متکلم دونوں میں پائی جاتی ہے، اس کی حقیقت وہ استحکام اور پختگی ہے جو دانشمندی پر مبنی ہو، جس طرح آگ حرارت سے معلوم کی جاتی ہے۔ اسی طرح حکمت اپنے اثرات سے پہچانی جاتی ہے۔ جب یہ کسی شخص کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندر حق شناسی کا ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے، اس کی زبان سے جو بات نکلتی ہے حق نکلتی ہے اور اس سے جو فعل صادر ہوتا ہے ٹھیک صادر ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں " لقمان " حکیم کے قصّہ میں اور حدیث میں بھی اس کے اثرات بیان کئے گئے ہیں۔ یہی چیز اللہ تعالیٰ کی آنکھ اور اس کا ہاتھ ہے جس کا حدیث میں ذکر ہوا۔۔۔۔ الخ (ص ۹۹ تا ص ۱۰۵ خلاصہ)

© rasailojaraid

اب آئیں " یزکیھم " کی طرف، تو " قرطبی " یہ رقم طراز ہیں کہ " اے یطھرھم من دَ حَضَ الشرك یعنی وسخ الشرك (شرک کی گندگی و آلودگی سے انہیں پاک کرتا ہے ۔) والزکاتہ تطھیر :

اور ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :

الزکوٰۃ مأخوذۃ من زکا الشی اذا نما وزاد ـــ

(جب کسی چیز میں نمو ہو اور وہ بڑھ جائے اور اس میں اضافہ ہو جائے) (تفسیر عثمانی ص۹۲)

-اور فرماتے ہیں " رجل زکی " زائد الخیر " انسان کو کہا جاتا ہے (القرطبی ص۳۴۳ ج ۲)

مولانا شبیر احمد عثمانی " تزکیہ " سے متعلق فرماتے ہیں " نفسانی آلائشوں اور تمام مراتب شرک و معصیت سے ان کو پاک کرنا اور دلوں کو مانجھ کر صیقل بنانا ۔ (تفسیر عثمانی ص۹۲)

ایک مفسر نے لکھا کہ :

" زکا " کھیتی پر بولا جاتا ہے جب اس میں نمو اور برکت حاصل ہو اور " تزکیہ " نفس کو خیرات و برکات سے بڑھانا ہے ۔ یہ بھی یاد رہے کہ فعل تزکیہ کبھی تو بندے کی طرف منسوب ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے اکتساب کرتا ہے جیسے سورۂ الشمس کی آیت ۹ میں ہے قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (بیشک وہ کامیاب ہوا جس نے اپنی روح کو پاک کر لیا)

اسی طرح سورۂ اعلیٰ کی آیت ۱۴ میں ہے : قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (بیشک وہ کامیاب ہوا جو پاک ہو گیا)

اور کبھی اس کی نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے کہ حقیقت میں " مزکی " وہی ہے ۔ سورۂ نور کی آیت ۲۱ کا ایک ٹکڑا ہے : وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّي مَنْ يَّشَاءُ (اور لیکن اللہ جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے ۔)

اور کبھی یہ لفظ نبی کی طرف منسوب ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ وہ واسطہ ہوتا ہے یعنی اس کی باتوں اور اس کے نمونہ سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے جیسے حضور علیہ السلام سے متعلق دعا اور جواب دعا پر مشتمل آیات میں لفظ تزکیہ استعمال ہوا ۔

مولانا امین احسن اصلاحی " تدبر قرآن " میں " یُزَکِّیھِمْ " کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ " تزکیہ کے دو مفہوم ہیں کہ پاک صاف کرنا ، نشوونما دینا اور یہ دونوں ہی باتیں لازم و ملزوم ہیں اس لئے کہ جو چیزیں مفاسد سے پاک ہوں گی وہ فطری صلاحیتوں کے مطابق پروان بھی چڑھیں گی "۔

آگے فرماتے ہیں :

" انبیاء جو تزکیہ کرتے ہیں اس میں دو نوں باتیں ہوتی ہیں، وہ اعمال و اخلاق کو غلط چیزوں سے پاک کرتے ہیں اور ان کے اعمال و اخلاق کو نشو و نما دے کر مفاسد کے بالمقابل استقامت کی قوت بھی پیدا کرتے ہیں ۔ (تدبر ، صہ ۲۹۸ ، ج ۱)

اس موقع پر ایک سوال ضرور سامنے آتا ہے کہ سیدنا ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی دعا میں پہلے تلاوت آیات کا ذکر ہے، پھر تعلیم کتاب و حکمت اور آخر میں تزکیہ، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تین مقامات پر بعثتِ نبوی کا مختلف انداز سے جو ذکر فرمایا اس میں ترتیب میں البتہ فرق ہے، اصولاً باتیں وہی ہیں —— ترتیب میں آیات کی تلاوت کے بعد "تزکیہ" کا ذکر آیا پھر تعلیم کتاب و حکمت کا —— ایسا کیوں ؟

اصل تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی عمل و ارشاد پر ہمیں "کیوں" کا حق ہی نہیں ، تاہم اس میں جو خاص رمز و اشارہ ہے یا اس کی جو حکمت ہے اس کی غرض سے یہ سوال سامنے آیا ۔ تو اس کا جواب کچھ اس طرح ہے کہ انسانی شخصیت ، فکر و عمل کے مجموعہ کا نام ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ غلط فکر سے غلط عمل ہی جنم لے گا جبکہ صحیح عمل کے لئے تصحیح فکر لازمی ہے ۔ فکر صحیح ہو جائے تو غلط خیالات و فاسد افکار از خود دور ہو جائیں گے ، قرآن عزیز کا اصل " فلسفۂ تزکیہ " یہی ہے ، جس کے لئے مصنوعی تدابیر کی چنداں ضرورت نہیں (جس کا ذکر آئندہ چل کر حکیم امت تھانوی قدس سرہ کے حوالہ سے آرہا ہے) بلکہ تزکیہ عمل لازمی نتیجہ ہے تطہیر فکر کا اور یہ وہ فطری ثمرہ ہے تلاوتِ آیات کا ، اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے مقاماتِ ثلاثہ میں تلاوت سے بعد معاً تزکیہ کا ذکر کیا —— بقول مولانا اصلاحی :

" پس تلاوت آیات کے بعد مذکورہ بالا آیات میں تزکیہ کا ذکر آرہا ہے ۔ تو یہ درحقیقت نتیجہ ہے تلاوت آیات کا ، اللہ کی آیات کی تلاوت سے انسان کے دل سے باطل خیالات و عقائد کی جڑیں جب کٹ جاتی ہیں تو اس کے دل کی زمین صحیح خیالات و عقائد کی تخم ریزی کے لئے بالکل پاک و صاف ہو جاتی ہے ۔

(مبادی تدبر قرآن صہ ۹۰ - ۸۹)

اور پھر ایسے دل میں تعلیم کتاب و حکمت اپنے اصل برگ و بار پیدا کرتی ہے اور پھر انسان صحیح معنوں میں "عبداللہ" (اللہ کا بندہ) بن جاتا ہے ۔

اس سلسلہ میں مختصر بحث " نبی اکرم علیہ السلام کا مقصد بعثت " (ڈاکٹر اسرار احمد صاحب) نامی

© rasailojaraid.c

کتابچہ میں ملاحظہ فرمالیں۔ تفصیل مطلوب ہو تو مولانا عبدالباری ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ خلیفہ حضرت حکیم امت تھانوی قدس سرہٗ کی کتاب "تجدید تصوف و سلوک" دیکھ لیں۔

نبی مکرم علیہ السلام دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن دین کی امانت امت کے سپرد کر گئے۔ اور "حجۃ الوداع" کے موقع پر "فلیبلغ الشاھد الغائب" کی نصیحت و حکم بھی فرما گئے۔ امت کے رجال دین نے اس امانت کی جس طرح حفاظت کی اور اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا وہ بلاشبہ ہماری تاریخ کا روشن باب ہے، لیکن اس وقت اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں، اس وقت گفتگو اس رخ پر ہے جس کا تعلق "تزکیہ" سے ہے۔ صدیوں سے اس خاص مقصد کی غرض سے "تصوّف" کی اصطلاح چل رہی ہے اور مختلف لوگ اس معاملہ میں افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ یہ بات اہل دین اور بالخصوص مقصدیت کے حامل افراد کے لئے مناسب نہیں، ان کی توجہ اور نظر ہمیشہ مقصد پر رہنی چاہیئے اور ان میں یہ احساس بیدار رہنا لازم ہے کہ دل کا معاملہ سب سے زیادہ نازک ہے۔ اور اس کی اصلاح بے حد ضروری ہے، ورنہ کوئی کام نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔

تصوّف کیا ہے؟ یہ اصطلاح کب سے شروع ہوئی، اس کا موجد کون ہے۔ اس انداز کے سوال وہ لوگ تو کر سکتے ہیں جنہیں زندگی میں صرف نظریاتی بحثوں میں وقت گزارنا ہے۔ اور جن کے پیش نظر کام ہے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کرتے بلکہ جہد و سعی میں لگے رہتے ہیں ــــ تاہم ایک مخلصانہ مشورہ کے طور پر اتنی گذارش کرنے میں حرج نہیں کہ دینِ اسلام، دینِ قیم ہے۔ اس میں کسی قسم کی کمی یا اعوجاج (ٹیڑھاپن) نہیں۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول، سید کائنات محمد عربی علیہ السلام کے ذریعے مکمل شکل میں ہمارے سپرد فرمایا ــــ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ حضور اکرم علیہ السلام کے مقاصدِ بعثت یا دوسرے لفظوں میں فرائض نبوت میں ایک اہم مقصد و فرض "تزکیہ" ہے۔ اس کا جو مفہوم و معنی ہے وہ بھی مختصراً سامنے آ چکا ہے۔ اس کی نہایت خوبصورت ترجمانی "حدیث جبریل" میں ہے جب سیدنا جبریل علیہ السلام حضرت نبی کریم علیہ السلام سے سوال کرتے ہیں:

فاخبرني عن الاحسان؟

"احسان" سے مراد بقول حضرت ملا علی القاری رحمہ اللہ تعالیٰ "اخلاص" ہے جو شرط ہے، ایمان و اسلام کی صحت کے لئے "ــــ بلکہ چند لفظ بعد" القاریؒ" فرماتے ہیں:

والاظھران المراد بہ احسان العمل وھو احکامہ واتقانہ و ھو یشتمل الاخلاص وما فوقہ من مرتبۃ الحضور مع اللہ ونفی

الشعور عما سواہ (صہ ۵۹، ج ۱)

یعنی "واضح اور ظاہر معنی یہ ہے کہ اس سے مراد "احسانِ عمل" ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی اور اس سے ڈرنا ہے اور یہ اخلاص پر ہی مشتمل نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ مرتبہ حضوری اور اس کے ماسوا کی نفی پر بھی مشتمل ہے۔"

اس سوال کے جواب میں حضور علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا وہ بھی اسی کی دلیل ہے ۔

ارشاد ہے:

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ۔

یعنی تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو ورنہ کم از کم یہ تو یقین رہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے ۔

اہلِ تزکیہ و احسان (صوفیاء) عبادت کا معنی کرتے ہیں:

ان العبادة حفظ الحدود والوفا بالعهود وقطع العلائق والشركاء عن شرك والفناء عن مشاهدتك فی مشاهدة الحق ــــ الخ،

(مرقات صہ ۶۰، ج ۱)

حدودِ الٰہی کی حفاظت، عہد و پیمان کو پورا کرنے، ماسوی اللہ کے تعلقات اور شرکاء کے شرک کو قطع کرنے، اپنی شخصیت و مشاہدہ کو حضرتِ حق کے مشاہدہ اور اس کی عظمت میں فنا کر دینے کا نام عبادت ہے ۔

اس مختصر تشریح سے "مقصد تزکیہ" خوب واضح ہو جاتا ہے اور یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ اس تزکیہ کا مقصد "احسان" یعنی اخلاص اور حضوریِ قلب کی شکل میں سامنے آتا ہے، وہی مقصود ہے اور اسی کے حصول پر پورے عمل و کردار کی اصلاح کا دار و مدار ہے ــــ اس لئے ایسے محققین اہلِ صدق و صفا کی کمی نہیں جو اس جدید اصطلاح "تصوّف" کے بجائے "احسان" ہی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے سنّت سے ثابت اعمال و اصطلاحات کی اہمیت، برکت اور عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے اسی اصطلاح یعنی "احسان" کو اپنا لیا جائے تو بڑا ہی مفید ہے۔ ایسا کرنے سے "بدعت" کے سبب جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور جس طرح نورِ سنّت "سے محرومی ہوتی ہے، اس سے بھی ہم بچ جائیں گے۔ اور سنّتِ مقدسہ کی ترویج و اشاعت اور اس کے" زندہ" کرنے کا ثواب حاصل کر پائیں گے۔ جو ایک بندۂ مومن کا طرّۂ امتیاز ہے

© rasailojaraid.com

قریبی دور کے "اہل احسان" میں حکیم امت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ ایک بہت بڑے انسان ہو گذرے ہیں، جنکی اردو زبان کی تفسیر "بیان القرآن" کو دیکھ کر امیر المؤمنین فی الحدیث مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اس تفسیر کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اردو کا دامن بھی علم سے خالی نہیں۔ اور یہی مولانا تھانوی تھے کہ سید الملۃ مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جب ان سے بیعت طریقت کی تو پھر ان کا رنگ ہی بدل گیا، حتیٰ کہ راولپنڈی میں میرے ایک مرحوم بزرگ حافظ ریاض احمد اشرفی کے ذخیرہ میں ان کا ایک خط موجود ہے جس میں انہوں نے اپنے بہت سے "تفردات" سے رجوع کیا اور یہ لکھا کہ جس سلیمان کو آپ تلاش کر رہے ہیں، مدت ہوئی وہ مر گیا۔

انہی مولانا تھانوی کی مجلسی گفتگوؤں کا ایک مجموعہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے ذمہ دار بزرگ کا مرتب کردہ موجود ہے۔ اس میں ایسے ہی مسائل کے ضمن میں مولانا فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ جو چیز انسان کے لیے جتنی زیادہ ضروری ہے اس کا حصول اتنا ہی سہل اور آسان بنا دیا گیا ہے، سب سے زیادہ ضرورت ہوا کی ہے وہ ہر جگہ ہر وقت مفت ملتی ہے بلکہ ایک درجہ میں جبراً ملتی ہے کہ اگر کوئی شخص اس سے بچنا چاہے تو بچ نہ سکے .... اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا یہ عام نفع کی چیز ہے، اس کی ہر کسی کو ضرورت ہے۔ فطرۃً اس کا آسان ہونا لازمی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگوں کے غلو نے اسے مشکل بنا دیا اور غیر ضروری اصول و اعمال کو تصوف سمجھ لیا۔ حالانکہ تصوف کچھ اور ہی ہے، وہ تو فقط توجہ الی اللہ ہے جس میں اس یقین کا ہونا ضروری ہے کہ ہم توجہ کریں گے تو وہ ہم سے زیادہ توجہ کرے گا (جیسا کہ حدیث میں ہے) اس میں کسی نفلی عمل کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ تکمیل فرائض ضروری ہے ـــــ اس سلسلہ میں مسند احمد میں ایک روایت بھی ہے کہ کسی نے کسی سے متعلق کہا اِنی لَاُبغِضُ ھٰذا؟ تو انہوں نے پلٹ کر پوچھا اس بغض کا سبب؟ انہوں نے کہا کہ میں نے تمہیں کبھی نفلی نماز وغیرہ میں مشغول نہیں دیکھا، انہوں نے کہا آپ نے مجھے کبھی فرائض میں کوتاہی دیکھی؟ کہا نہیں ـــــ فرمایا بس میں اتنا ہی کافی سمجھتا ہوں اور پھر وہ دونوں پیغمبر اقدس کے حضور گئے تو آپ نے ان کی تصویب فرمائی کہ یہ درست کہتے ہیں۔ (صفحہ ۲۰۰، ۲۰۱)

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "اصولِ تصوف" محض یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یاد ہو اور احکام شرعیہ

کا اہتمام، اس کے علاوہ جو اشغال ہیں وہ ضرورۃً ہیں۔ اس طریق کا جزو نہیں۔ (ص۲۱۶)

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ:

"طریقت اور تصوّف نام ہے شریعت پر مکمل اور پورے پورے عمل کا (اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (الآیہ - البقرہ) اعمالِ ظاہرہ کی طرح اعمالِ باطنہ بھی ہیں اور ان کی اصلاح بھی لازم ہے، اس میں سب سے پہلے عقائد کی درستی ہے پھر اخلاق کی اصلاح تکبر، حسد، بغض، حرص، حب جاہ و مال سے بچنا، تواضع، قناعت، صبر، شکر، اللہ تعالیٰ سے محبت، اللہ کے رسولؐ کی کامل اطاعت، ان کو حاصل کرنا ہی ساری طریقت و تصوف ہے"۔

امام شعرانی رحمہ اللہ تعالیٰ "الیواقیت والجواھر" میں لکھتے ہیں کہ اعمال باطنہ اور ان کے احکام "فقہ اسلامی" کا باقاعدہ حصہ تھے لیکن کتبِ فقہ میں ان کی تدوین اس لئے نہ ہوئی کہ عموماً ان کا اہتمام ہر مسلم گھرانے میں موجود تھا۔ اور کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ان سے واقف نہ ہو اور ان پر عامل نہ ہو، بعد میں جب لوگ غفلت کا شکار ہو گئے تو اس کی تدوین بطور ایک فن کے ہو گئی اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے نبی امی علیہ السلام کے زمانہ میں حدیث و فقہ کی تدوین نہ تھی۔ بعد میں ضرورت پر اس کا اہتمام ہوا۔

الملختص: اعمالِ باطنہ کے احکام کتب فقہ میں مدوّن نہ ہونے سے یہ دھوکا کھانا صحیح نہیں کہ یہ شرعی احکام نہیں یا ان کی اہمیت نماز روزہ سے کم ہے ___ نہیں بلکہ ان کی اہمیت اسی طرح ہے بلکہ بعض حالتوں میں ان سے بڑھ کر۔ (ص ۱۴۰)

ایک جگہ فرمایا کہ میرے نزدیک صوفی کی تعریف "عالم باعمل" ہے۔ باقی جو باتیں ہیں وہ تعریف کا جزو نہیں، اس کے ثمرات ہیں (ص۳۰۲)

جس طرح زندگی کے کسی میدان میں بھی کوئی شخص اپنے استاد کی عظمت، احترام اور اس کی قدردانی کے بغیر کامیابی حاصل نہیں کرسکتا، اسی طرح اس راہ کے جو مرد میدان ہیں، ان کی صحبت، احترام اور ان سے محبّت و تعلق لازم ہے ورنہ کوئی تعلیم و تلقین کارگر نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت مولانا و مقتدانا السید محمد اسمٰعیل شہید دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے "منصبِ امامت" میں لکھا ہے کہ:

بزرگوں، مشائخ کا فیض صحبتِ آفتاب کے مشابہ ہے کہ اس کا فائدہ سبھی کو ہوتا ہے استفادہ کرنے والے کو اس کی خبر ہو یا نہ ہو اور وہ استفادہ کا قصد کرے یا نہ کرے۔

© rasailojaraid.c

قریبی دور کے "اہلِ احسان" میں حکیم امت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ ایک بہت بڑے انسان ہو گذرے ہیں، جنکی اردو زبان کی تفسیر "بیان القرآن" کو دیکھ کر امیر المؤمنین فی الحدیث مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اس تفسیر کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اردو کا دامن بھی علم سے خالی نہیں۔ اور یہی مولانا تھانوی تھے کہ سید الملۃ مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جب ان سے بیعت طریقت کی تو پھر ان کا رنگ ہی بدل گیا، حتیٰ کہ راولپنڈی میں میرے ایک مرحوم بزرگ حافظ ریاض احمد اشرفی کے ذخیرہ میں ان کا ایک خط موجود ہے جس میں انہوں نے اپنے بہت سے "تفردات" سے رجوع کیا اور یہ لکھا کہ جس سلیمان کو آپ تلاش کر رہے ہیں، مدت ہوئی وہ مر گیا۔

انہی مولانا تھانوی کی مجلسی گفتگوؤں کا ایک مجموعہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے جیسے ذمہ دار بزرگ کا مرتب کردہ موجود ہے۔ اس میں ایسے ہی مسائل کے ضمن میں مولانا فرماتے ہیں:

> اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ جو چیز انسان کے لیے جتنی زیادہ ضروری ہے اس کا حصول اتنا ہی سہل اور آسان بنا دیا گیا ہے، سب سے زیادہ ضرورت ہوا کی ہے وہ ہر جگہ ہر وقت مفت ملتی ہے بلکہ ایک درجہ میں جبراً ملتی ہے کہ اگر کوئی شخص اس سے بچنا چاہے تو بچ نہ سکے .... اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا یہ عام نفع کی چیز ہے، اس کی ہر کسی کو ضرورت ہے۔ فطرۃً اس کا آسان ہونا لازمی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگوں کے غلو نے اسے مشکل بنا دیا اور غیر ضروری اصول و اعمال کو تصوف سمجھ لیا۔ حالانکہ تصوف کچھ اور ہی ہے، وہ تو فقط توجہ الی اللہ ہے جس میں اس یقین کا ہونا ضروری ہے کہ ہم توجہ کریں گے تو وہ ہم سے زیادہ توجہ کرے گا (جیسا کہ حدیث میں ہے) اس میں کسی نفلی عمل کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ تکمیل فرائض ضروری ہے ــــ اس سلسلہ میں مسند احمد میں ایک روایت بھی ہے کہ کسی نے کسی سے متعلق کہا انی لا بغض ھذا؟ تو انہوں نے پلٹ کر پوچھا اس بغض کا سبب؟ انہوں نے کہا کہ میں نے تمہیں کبھی نفلی نماز وغیرہ میں مشغول نہیں دیکھا، انہوں نے کہا آپ نے مجھ سے کبھی فرائض میں کوتاہی دیکھی؟ کہا نہیں ــــ فرمایا بس میں اتنا ہی کافی سمجھتا ہوں اور پھر وہ دونوں پیغمبر اقدس کے حضور گئے تو آپ نے ان کی تصویب فرمائی کہ یہ درست کہتے ہیں۔ (صـ ۲۰۰، ۲۰۱)

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "اصولِ تصوف" محض یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یاد ہو اور احکام شرعیہ

کا اہتمام، اس کے علاوہ جو اشغال ہیں وہ ضرورۃً ہیں۔ اس طریق کا جزو نہیں۔ (ص۲۱۶)

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ:

"طریقت اور تصوّف نام ہے شریعت پر مکمل اور پورے پورے عمل کا 'اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً' (الآیہ۔ البقرہ) اعمالِ ظاہرہ کی طرح اعمالِ باطنہ بھی ہیں اور ان کی اصلاح بھی لازم ہے۔ اس میں سب سے پہلے عقائد کی درستی ہے پھر اخلاق کی اصلاح، تکبر، حسد، بغض، حرص، حبِ جاہ و مال سے بچنا، تواضع، قناعت، صبر، شکر، اللہ تعالیٰ سے محبت، اللہ کے رسولؐ کی کامل اطاعت، ان کو حاصل کرنا ہی ساری طریقت و تصوف ہے۔"

امام شعرانی رحمہ اللہ تعالیٰ "الیواقیت والجواھر" میں لکھتے ہیں کہ اعمالِ باطنہ اور ان کے احکام "فقہ اسلامی" کا باقاعدہ حصہ تھے لیکن کتبِ فقہ میں ان کی تدوین اس لیے نہ ہوئی کہ عملاً ان کا اہتمام ہر مسلم گھرانے میں موجود تھا۔ اور کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ان سے واقف نہ ہو اور ان پر عامل نہ ہو۔ بعد میں جب لوگ غفلت کا شکار ہو گئے۔ تو اس کی تدوین بطور ایک فن کے ہو گئی اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے نبی امی علیہ السلام کے زمانہ میں حدیث و فقہ کی تدوین نہ تھی۔ بعد میں ضرورت پر اس کا اہتمام ہوا۔

المختصر: اعمالِ باطنہ کے احکام کتبِ فقہ میں مدوّن نہ ہونے سے یہ دھوکا کھانا صحیح نہیں کہ یہ شرعی احکام نہیں یا ان کی اہمیت نماز روزہ سے کم ہے ــــ نہیں بلکہ ان کی اہمیت اسی طرح ہے بلکہ بعض حالتوں میں ان سے بڑھ کر۔ (ص ۱۴۰)

ایک جگہ فرمایا کہ میرے نزدیک صوفی کی تعریف "عالم باعمل" ہے۔ باقی جو باتیں ہیں وہ تعریف کا جزو نہیں، اس کے ثمرات ہیں (ص ۳۰۲)

جس طرح زندگی کے کسی میدان میں بھی کوئی شخص اپنے استاد کی عظمت، احترام اور اس کی قدردانی کے بغیر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا، اسی طرح اس راہ کے جو مردِ میدان ہیں، ان کی صحبت، احترام اور ان سے محبت و تعلق لازم ہے ورنہ کوئی تعلیم و تلقین کارگر نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت مولانا و مقتدانا السید محمد اسمٰعیل شہید دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے "منصبِ امامت" میں لکھا ہے کہ:

بزرگوں (مشائخ) کا فیضِ صحبتِ آفتاب کے مشابہ ہے کہ اس کا فائدہ سبھی کو ہوتا ہے استفادہ کرنے والے کو اس کی خبر ہو یا نہ ہو اور وہ استفادہ کا قصد کرے یا نہ کرے۔

© rasailojaraid.c

یہی حال بزرگانِ دین اور مشائخ کا ہے اور ایسے حضرات کی علامت یہ ہوتی ہے کہ جب آدمی ان سے دور ہوتا یا ان کی وفات ہوتی ہے تو قلوب میں ایک طرح کی ظلمت محسوس ہوتی ہے۔

اس پر مولانا تھانوی نے ایک روایت سے استشہاد بھی کیا ہے کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے سرورِ کائنات علیہ السلام کی وفات پر کہا:

وَاللّٰهُ مَا اَنْفَضْنَا اَيْدِيَنَا مِنَ التُّرَابِ حَتّٰى اَنْكَرْنَا قُلُوْبَنَا

کہ رسول اکرم علیہ السّلام کی تدفین کر کے ہم نے مٹی سے ہاتھ بھی نہ جھاڑے تھے کہ ہمارے قلوب میں تغیر محسوس ہونے لگا۔ (صہ ۱۰۸-۱۰۷)

اور اسی کی تائید میں وہ روایت بھی ہے جس میں حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے "نفاق" کا خدشہ ظاہر کیا، اس پر حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا خیریت تو ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ صحبتِ نبوی میں اور کیفیت ہوتی ہے، وہاں سے علیحدگی پر حال ہی بدل جاتا ہے۔ —— تو سیدنا صدیق چونک پڑے، فرمایا، میرا بھی یہی حال ہے اور پھر دونوں خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ عرض کیا تو رسول اکرم علیہ السّلام نے تسلّی دلائی کہ میری صحبت و معیت میں جو کیفیت تمہیں حاصل ہوتی ہے اگر سدا وہی رہے تو مدینہ کی گلیوں میں اللہ تعالیٰ کے فرشتے تم سے مصافحے کرتے پھریں۔ —— اور ایسے ہی اہل کمال کے متعلق فرمایا گیا کہ

"اللہ والے وہ ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آجائیں۔" (حدیثِ نبویؐ)

اس راہ کے مسافر، تین خوبیوں سے متصف ہوں تو وہ کامل شمار ہوتے ہیں اور اس قابل کہ وہ دوسروں کے قلوب کی صفائی کا اہتمام کریں۔ حضرت شیخ الاسلام بابا فرید اجودھنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب خادم خواجہ نظام الدین بدایونی ثم دہلوی کو جب دہلی روانہ فرمایا کہ تغلق آباد (دہلی) میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کرو تو ساتھ ہی فرمایا:

"باری تعالیٰ ترا علم و عقل و عشق عطا فرمودہ است و ہر کہ بایں سہ صفات متصف باشد خرقہ خلافت او را نیکو آید" (فوائد الفوائد)

اس میں جن تین خوبیوں کا ذکر ہے اور جن کے حامل کو ہم نے "کامل" کہا، انمیں پہلا وصف اور پہلی خوبی "علم" ہے جس کا حصول و طلب اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نے ہر مسلمان کے لئے لازم قرار دیا

"طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم"

حاملینِ علم کے لئے ارشاد ہے:

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (الفاطر ۲۸)

"اللہ سے اس کے بندوں میں سے عالم ہی ڈرتے ہیں"

حاملینِ علم کے لئے ارشاد ہے:

اور يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ

(المجادلہ: ۱۱)

تم میں سے اللہ ایمانداروں کے اور ان کے جنہیں علم دیا گیا، درجے بلند کرے گا۔

علم میں "علم کسبی" کے ساتھ "علم وہبی ولدنّی" بھی شامل ہے۔ جسے حضرت الامام الشافعی قدس سرہ نے "اللہ تعالیٰ کے نور" سے تعبیر فرمایا:

شکوت الی وکیع سوء حفظی   فاوصانی الی ترک المعاصی

فان العلم نور من الٰہٖ   و نور اللہ لا یعطی لعاصی

اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ان دونوں کی تعبیر "معلومات اور ذوق" سے فرمائی۔

دوسری صفت عقل ہے۔ یعنی وہ قوت جس کے ذریعے ایک انسان اشیاء کے حقائق و خواص کا ادراک کرتا ہے۔ اور درجہ آخر میں اس سے مراد "عقلِ سلیم" ہے جو اپنے عمل میں غلطی نہیں کرتی اور بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ قرآن میں جہاں بھی "عقل" کا لفظ آیا ہے، وہاں "عقلِ سلیم" ہی مراد ہے۔ آخر مشرکوں کو بے عقل کیوں کہا گیا! کیا وہ معمولی کی عقل سے بھی محروم تھے، نہیں بلکہ "عقلِ سلیم" سے محروم تھے۔

تیسری صفت "عشق" ہے۔ جس سے آسان لفظوں میں مراد حقیقتِ مطلقہ یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس سے وہ تعلق ہے جس کا تقاضا وہ ہم سے کرتا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ (البقرہ: ۱۶۵)

اور ایمان والوں کو تو اللہ تعالیٰ ہی سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔

حدیثِ جبریلؑ جس کا حوالہ پہلے گذر چکا ہے اس میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ مشاہدہ حق میں اس غرق ہو جاؤ اور تمہارا کل روح یادِ الٰہی میں اس طرح ڈوب جائے کہ بس وہی ہر وقت تمہارے سامنے۔

اقبال مرحوم نے اپنے فارسی و اردو کلام میں اس طرف بہت اچھے اشارے کئے:

من بندۂ آزادم عشق است امام من   عشق است امام من عقل است غلام من

© rasailojaraid.com

ہنگامۂ ایں محفل از گردشِ جامِ من　　ایں کوکبِ شامِ من، ایں ماہِ تمامِ من

جانی در عدم آسودہ بے ذوقِ تمنّا بود　　مستانہ نواہا زد در حلقۂ دامِ من

واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ کیفیت حاصل ہے تو علم، حکمت، عبادت، ریاضت سبھی معتبر ہیں، ورنہ محض دھوکہ! بقول اقبال مرحوم

شہیدِ محبّت نہ کافر نہ غازی　　محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی

یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے!!　　تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی

نہ محتاجِ سلطان، نہ مرعوبِ سلطان　　محبّت ہے آزادی و بے نیازی

"قلب" کو جو اہمیت ہے اس کا اندازہ اس حدیث سے فرمائیں جس کے راوی ہیں سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جسے حضرات امام بخاری و مسلم قدس سرہما نے نقل کیا۔ (ترجمہ یہ ہے):

نبی مکرّم، رسولِ رحمتؐ نے فرمایا: حلال و حرام کا معاملہ تو واضح ہے (انمیں سے ہر ایک کا واضح بیان ہوگیا) البتہ ان کے درمیان ایک درجہ ہے وہ یہ کہ بعض اشیاء مشتبہ ہوتی ہیں، جنہیں بہت سے (چنگے بھلے) لوگ بھی نہیں جانتے۔ ان سے جو بچ گیا اس نے اپنے دین اور آبرو کی سلامتی کا سامان کر لیا اور جس نے ان کے معاملے میں احتیاط نہ برتی اور ان میں مبتلا ہوگیا، اس کا کھلے حرام میں بھی مبتلا ہونے کا خطرہ ہے (اس کی مثال دیتے ہوئے آپ نے فرمایا) کہ جیسے ایک بکریاں چرانے والا مخصوص چراگاہ کے ارد گرد بکریاں چرا رہا ہو تو اس کا امکان ہے کہ اس کی بکریاں چراگاہ کے اندر تک پہنچ جائیں ــــ یاد رکھو کہ ہر بادشاہ کی مخصوص چراگاہ ہوتی ہے (جس میں داخلہ کی اجازت نہیں ہوتی) اللہ تعالیٰ جو احکم الحاکمین ہیں، ان کی چراگاہ اس کے حرام کردہ محارم ہیں (حرام کردہ چیزیں، جن سے بچنا لازم ہے) یاد رکھو انسانی جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ جب تک وہ درست ہوگا تو سارا جسم سلامت رہے گا، وہ فاسد ہو جائے گا تو پھر سارے جسم کا بگاڑ لازم ہے ــــ یاد رکھو وہ قلب ہے۔　(مشکوٰۃ ص ۲۴۱)

اسی سلسلہ میں ایک اور حدیث ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ ہیں، حضور علیہ السلام کے ارشاد کا مطلب ہے کہ:

l.com

جب بنی آدم کوئی گناہ کا کام کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نشان (نقطہ) پڑ جاتا ہے توبہ و استغفار کے باعث وہ نقطہ دھل جاتا اور قلب صاف ہو جاتا ہے لیکن اگر توبہ نہ ہوئی اور گناہوں کا سلسلہ بڑھتا رہا تو وہ دل پر اس طرح غالب آ جائیں گے کہ سارا دل سیاہ ہو جائے گا۔ اسی کیفیت کو "ران" سے تعبیر کیا گیا ہے (یہ اشارہ ہے سورہ مطففین کی آیت ۱۴ کی طرف جسے حضور علیہ السلام نے یہاں تلاوت بھی فرمایا، اس کا ترجمہ ہے) "ہرگز نہیں بلکہ اُن کے (برے) کاموں سے ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے"

(احمد، ترمذی، ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ صہ ۲۰۴)

اور ایک حدیث میں ہے:

یہ دل بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے لوہے پر پانی پڑنے سے وہ زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ اس پر صحابہ کرام علیہم الرضوان نے عرض کیا: فما جلاءھا یارسول اللہ۔ پھر ان دلوں کو صیقل کیسے جائے؟ تو جواب میں آپؐ نے ارشاد فرمایا: کثرۃ ذکر الموت وتلاوۃ القرآن: رواہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہما۔

(البیہقی فی شعب الایمان / مشکوٰۃ صہ ۱۸۹)

آئینہ قلب کی صفائی ہو جائے اور انسان دولتِ احسان سے مالا مال ہو جائے اور اسے حضوریٔ قلب کی نعمت عظمیٰ میسّر ہو تو پھر اس کا حال مجدد سرہندی قدس سرہٗ جیسا ہو جاتا ہے جو "خوف و رجاء" کی کیفیت کا شکار ہو کہ جہاں اللہ تعالیٰ سے خیر کی امیدیں وابستہ رکھتے ہیں، وہاں یہ خطرہ بھی لاحق رہتا ہے کہ نہ معلوم انجام کیا ہوگا؟۔ ایسے حضرات کی نظر " الاعمال بالخواتیم" پر ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ "کافر افرنگ" سے نفرت کو بھی جرم گردانتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"معرفت حق برآں کس حرام است کہ خود را از کافر فرنگ بہتر می گرداند"

اس کی وجہ یہی ہے کہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص عمر بھر کی خرابیوں کے باوجود آخری وقت میں کسی "خیر" سے مالا مال ہو کر بخشش کا مستحق ہو جائے اور ایک شخص ساری عمر بھلائیاں کر کر کے آخر میں بدنصیبی کا شکار ہو جائے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس طرح کی ایک روایت نبی اکرم علیہ السلام سے نقل کی۔

© rasailojaraid.c